ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2960

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: اسلام اور انسانی حقوق (2960) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (بونس: 5 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ اس گائیڈ میں انسانی حقوق سے متعلق موضوعات صرف تعلیمی مطالعے کے طور پر بیان کیے گئے ہیں؛ کسی فرد یا معاملے پر کسی دینی یا قانونی حکم کا اطلاق طلبہ کا کام نہیں، یہ اختیار مستند علماء، اہلِ افتاء اور ریاست کی مجاز عدالتوں اور اداروں کا ہے۔

سوال نمبر 1: خطبہ حجۃ الوداع — عالمی منشورِ انسانی (20 نمبر)

سوال نمبر 1: خطبہ حجۃ الوداع کے زمان و مکان (9 ذوالحجہ 10ھ، میدانِ عرفات) کی اہمیت بیان کریں۔ اس خطبے کو "عالمی منشورِ انسانی" کیوں کہا جاتا ہے؟ (20 نمبر)

تعارف

خطبہ حجۃ الوداع انسانی تاریخ کے ان چند خطبات میں سے ہے جن کا اثر ایک اجتماع سے نکل کر پوری انسانیت تک پھیلا۔ یہ خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقع پر ارشاد فرمایا، اسی لیے اسے حجۃ الوداع یعنی الوداعی حج اور اس کے خطبے کو آپ کی وصیتوں کا خلاصہ کہا جاتا ہے۔ اس خطبے کے زمان و مکان کا تعین خود سوال میں دیا گیا ہے: 9 ذوالحجہ 10 ہجری، میدانِ عرفات۔ اس جواب میں پہلے اس زمان و مکان کی دینی، تاریخی اور علامتی اہمیت بیان کی جائے گی، پھر خطبے کے اہم مضامین کا تعارف پیش کیا جائے گا، اور آخر میں ان وجوہ کی تفصیل دی جائے گی جن کی بنا پر علماء و محققین اس خطبے کو "منشورِ انسانی" کہتے ہیں اور اس کا موازنہ جدید انسانی حقوق کے اعلانات سے کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ خالص تعلیمی ہے؛ خطبے کے اصولوں سے کسی معاصر معاملے پر قانونی حکم لگانا اہلِ علم اور ماہر اداروں کا کام ہے۔

زمان کی اہمیت: 9 ذوالحجہ 10 ہجری

9 ذوالحجہ کو یومِ عرفہ کہا جاتا ہے، جو حج کا سب سے بڑا رکن اور سال کے افضل ترین دنوں میں سے ہے۔ اسی دن دنیا بھر کے حاجی ایک میدان میں جمع ہوتے ہیں، اس لیے اس دن دیا گیا پیغام فطری طور پر سب سے بڑے انسانی اجتماع تک پہنچتا ہے۔ سن 10 ہجری کی اہمیت یہ ہے کہ اس وقت تک اسلام کا پیغام جزیرہ نما عرب کے بیشتر حصوں تک پہنچ چکا تھا، مکہ فتح ہو چکا تھا، وفود آ کر اسلام قبول کر چکے تھے اور قرآن مجید کا نزول تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ روایات کے مطابق اسی حج کے دوران سورۃ المائدہ کی وہ آیت نازل ہوئی جس کا مفہوم ہے کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اس پس منظر میں یہ خطبہ کسی ابتدائی تعلیم کا اعلان نہیں بلکہ مکمل دین کا آخری خلاصہ اور امت کے نام الوداعی وصیت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں بار بار پوچھا کہ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا، اور صحابہ کے اقرار پر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ کو گواہ بنایا؛ یہ انداز اس زمان کی تاریخی حساسیت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض ایک وعظ نہیں بلکہ امانت کی حوالگی کا اعلان تھا۔ اسی لیے صحابہ نے اس خطبے کو نسل در نسل محفوظ رکھا اور اس کے مضامین بخاری و مسلم سمیت حدیث کی بڑی کتابوں میں روایت ہوئے۔

مکان کی اہمیت: میدانِ عرفات

میدانِ عرفات مکہ مکرمہ کے قریب وہ وسیع میدان ہے جہاں ہر سال حاجی 9 ذوالحجہ کو وقوف کرتے ہیں اور حدیث کے مطابق حج عرفہ ہی کا نام ہے، یعنی اس وقوف کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ اس مکان کی علامتی اہمیت بہت گہری ہے۔ یہاں بادشاہ اور فقیر، امیر اور غریب ایک جیسے سادہ لباس یعنی احرام میں، بغیر کسی ظاہری امتیاز کے کھڑے ہوتے ہیں، گویا میدانِ عرفات خود انسانی مساوات کا عملی منظر ہے۔ ایسے مکان میں دیا گیا خطبہ جو مساوات، جان و مال کی حرمت اور حقوق کی ادائیگی پر ہو، مکان اور مضمون کی کامل مناسبت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں عرفات حرم کی حدود سے باہر مگر مشاعرِ مقدسہ میں شامل ہے اور روایات میں اسے وہ مقام بھی بتایا گیا ہے جہاں انسانیت کے جد آدم علیہ السلام سے جڑی یادیں وابستہ ہیں، البتہ ان روایات کی تفصیل میں جانا اس جواب کا موضوع نہیں۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ اس خطبے کے سامعین ایک قبیلے یا شہر کے لوگ نہیں تھے بلکہ مختلف قبائل، علاقوں اور حیثیتوں کے لاکھ کے قریب مسلمان تھے، جو واپس جا کر یہ پیغام اپنے اپنے علاقوں تک پہنچانے والے تھے۔ آپ نے حاضرین کو حکم بھی دیا کہ حاضر غائب تک یہ باتیں پہنچائے، اس طرح میدانِ عرفات اس عالمی پیغام کا نقطہ آغاز بن گیا۔

خطبے کے اہم مضامین کا خلاصہ

خطبے کے مضامین کو چند بڑے عنوانات میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ اول، جان، مال اور عزت کی حرمت کا اعلان کہ تمہارے خون، مال اور آبرو اسی طرح محترم ہیں جیسے یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہے۔ دوم، امانتوں کی واپسی اور سود کی مطلق ممانعت، جس میں سب سے پہلے اپنے خاندان کے سود کو ختم کر کے عملی مثال قائم کی گئی۔ سوم، جاہلیت کے خون کے بدلے اور انتقامی دعوؤں کا خاتمہ، یعنی پرانے قتل و دشمنی کے حساب کتاب بند کر دیے گئے۔ چہارم، عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ احسان کی وصیت، نیز مرد و عورت کے باہمی حقوق کی یاد دہانی۔ پنجم، نسلی و قومی تفاخر کی نفی اور تقویٰ کو فضیلت کا واحد معیار قرار دینا۔ ششم، قرآن و سنت کو مضبوطی سے تھامنے کی وصیت اور شیطان کی پیروی سے خبردار کرنا۔ ششم کے بعد یہ بھی اہم ہے کہ آپ نے اپنے بعد کے لیے امت کو گمراہی سے بچنے کا نسخہ دیا اور ہر فرد کو اس کے حصے کی ذمہ داری سونپی۔ یہ تمام

مضامین حدیث کی مختلف روایات میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور محدثین نے انہیں جمع کر کے خطبے کی صورت دی ہے، اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ کسی ایک راوی کی جزوی روایت کو پورا خطبہ نہ سمجھے بلکہ مجموعی مضامین کو دیکھے۔

جدول 1: خطبہ حجۃ الوداع کے مضامین اور ان کا انسانی حق

مضمون	حق جو قائم ہوا	جدید اصطلاح میں مطابقت
جان و مال و عزت کی حرمت	جانی زندگی، عزت و عزت کا تحفظ	زندگی و تحفظ کا حق
سود کی ممانعت	معاشی استحصال سے تحفظ	معاشی حقوق و منصفانہ معیشت
جاہلی بدلے کا خاتمہ	انتقام کے بجائے قانون و صلح	عدل و قانونی تحفظ
عورتوں سے احسان کی وصیت	خواتین کے حقوق و عزت	خواتین کے حقوق
نسلی فخر کی نفی	مساوات و عدم امتیاز	مساوات کا عالمی اصول

اسے عالمی منشورِ انسانی کیوں کہا جاتا ہے؟

اس خطبے کو عالمی منشورِ انسانی کہنے کی پہلی وجہ اس کا مخاطب ہے: خطبہ کسی قوم یا مذہب کے ماننے والوں سے نہیں بلکہ اے انسانو اور اے لوگو کے خطاب کے ساتھ پوری انسانیت سے ہے۔ دوسری وجہ اس کے اصولوں کی عالمگیریت ہے؛ جان و مال کی حرمت، مساوات، عورتوں کے حقوق اور معاشی انصاف وہ اصول ہیں جو ہر زمانے اور ہر خطے کے انسان کی ضرورت ہیں۔ تیسری وجہ اس کی زمانی ترجیح ہے؛ یہ اعلان 632ء کے مطابق 10 ہجری میں ہوا، جبکہ مغرب کے مشہور اعلانات میگنا کارٹا 1215ء، امریکی اعلان 1776ء اور انسانی حقوق کا عالمی اعلان 1948ء اس سے صدیوں بعد آئے، اور ان میں بھی ابتدائی دستاویزات کا دائرہ محدود طبقات تک تھا۔ چوتھی وجہ اس کا عملی نفاذ ہے؛ خطبے کے اصول اعلان ہوتے ہی اسی معاشرے میں نافذ ہوئے، سود اور بدلے کا خاتمہ اسی دن سے عمل میں آیا اور مقرر نے اپنے خاندان سے آغاز کر کے مثال قائم کی۔ پانچویں وجہ اس

کی ضمانت کی نوعیت ہے؛ جدید منشوروں کی ضمانت قانون اور ریاست ہے، جبکہ اس خطبے میں ہر حق کے ساتھ اللہ کی گواہی اور آخرت کی بازپرس جوڑ دی گئی، جس سے یہ اصول ضمیر کے اندر بھی محفوظ ہو گئے۔ انہی وجوہ سے غیر مسلم محققین نے بھی اس خطبے کو انسانی حقوق کی تاریخ کے اولین جامع اعلانات میں شمار کیا ہے، البتہ اس موازنے میں احتیاط لازم ہے کہ یہ خطبہ وحی پر مبنی دینی وصیت ہے، کوئی سیاسی دستاویز سازی نہیں۔

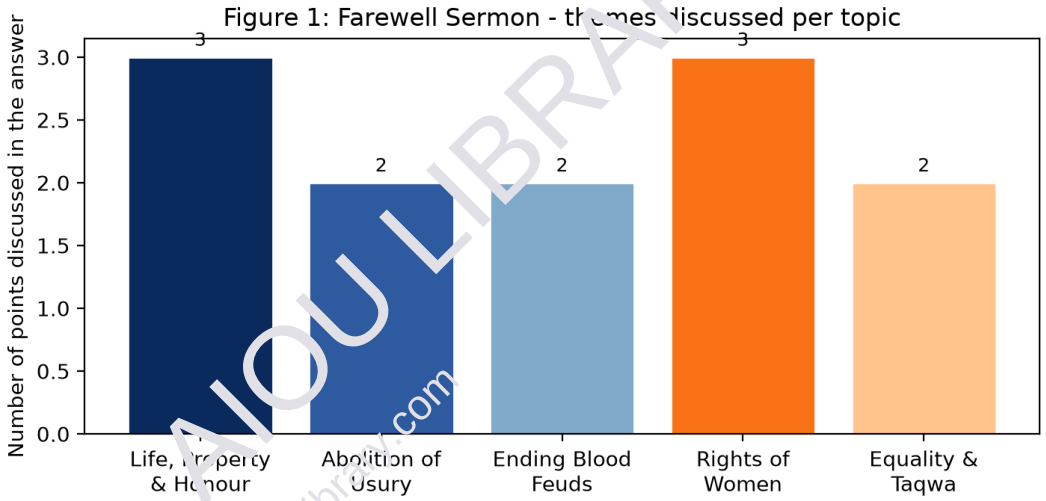

شکل 1: خطبہ حجۃ الوداع کے پانچ بڑے مضامین کا خاکہ (تعلیمی خاکہ)

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کا زمان 9 ذوالحجہ 10 ہجری اسے دین کی تکمیل کے اعلان اور الوداعی وصیت کا درجہ دیتا ہے اور اس کا مکان میدانِ عرفات اسے دنیا کے سب سے بڑے مساوی اجتماع اور عالمگیر اشاعت کا مرکز بناتا ہے۔ خطبے نے جان، مال، عزت، مساوات، عورتوں کے حقوق اور معاشی انصاف جیسے عالمگیر اصول ایک ساتھ اور عملی نفاذ کے ساتھ پیش کیے، یہی وجہ ہے کہ اسے بجا طور پر عالمی منشورِ انسانی کہا جاتا ہے۔ طالب علم کے لیے اس خطبے کا سبق یہ ہے کہ انسانی حقوق کی اصل حفاظت اسی وقت ممکن ہے جب اصول کتابوں کے ساتھ دلوں میں بھی اتر جائیں اور مقرر خود ان پر عمل کی پہلی مثال بنے۔

سوال نمبر 2: عہدِ نبوی میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ عدلِ اجتماعی (20 نمبر)

سوال نمبر 2: عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ عدلِ اجتماعی کے عملی مظاہر بیان کریں، خصوصاً قتل، قصاص اور قانونی مساوات کے تناظر میں۔ (20 نمبر)

تعارف

مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست ایک کثیر المذہبی معاشرہ تھی جس میں مسلمانوں کے ساتھ یہودی قبائل، مشرکین اور بعد میں دیگر اہلِ کتاب بھی رہتے تھے۔ اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثریت کی ریاست میں اقلیتوں کو انصاف کیسے ملا اور کیا قانون کے سامنے مسلم اور غیر مسلم برابر تھے؟ سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقلیتوں کے حقوق کو تحریری معاہدوں، مساوی قانون اور عملی عدل کے ذریعے محفوظ کیا اور خاص طور پر جان کے تحفظ، قصاص اور عدالت کے سامنے مساوات میں کوئی مذہبی امتیاز روا نہیں رکھا۔ اس جواب میں پہلے میثاقِ مدینہ کی بنیاد، پھر جان و مال کے تحفظ کے مظاہر، پھر قتل و قصاص کے تناظر میں مساوات کی مثالیں اور آخر میں اس نظام کی اہمیت بیان کی جائے گی۔ یہ بحث خالص تاریخی و تعلیمی ہے؛ سزاؤں کا نفاذ ہمیشہ مجاز عدالت و ریاست کا اختیار رہا ہے، افراد کا نہیں۔

میثاقِ مدینہ: اقلیتوں کے حقوق کی تحریری بنیاد

ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے قبائل کے درمیان وہ تحریری معاہدہ کرایا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے اور جسے بہت سے محققین دنیا کے اولین تحریری آئینوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس معاہدے میں یہودی قبائل کو مسلمانوں کے ساتھ ایک مشترکہ سیاسی برادری کا حصہ قرار دیا گیا، ان کے مال و جان کا تحفظ تسلیم کیا گیا، مذہب کی آزادی دی گئی کہ یہودیوں کے لیے ان کا دین اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین ہے، اور یہ طے پایا کہ ظلم کرنے والا چاہے کوئی ہو اس کے خلاف سب ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ معاہدے میں یہ بھی درج تھا کہ تنازعات کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے گا، جس سے عدالتی مرکزیت قائم ہوئی اور قبائلی انتقام کا راستہ بند ہوا۔ اس دستاویز کی اہمیت یہ ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کسی حکمران کی مہربانی نہیں بلکہ تحریری و معاہداتی حق بن گئے جن کی خلاف ورزی معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ بعد میں نجران کے

عیسائی وفد کے ساتھ معاہدے میں بھی ان کی جان، مال، عبادت گاہوں اور پادریوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور وہ وفد مدینہ قیام کے دوران مسجدِ نبوی میں اپنی عبادت کی اجازت کے واقعے سے فقہی کتب میں مذکور ہے، جو مذہبی رواداری کی غیر معمولی مثال ہے۔

جان، مال اور عزت کے تحفظ کے عملی مظاہر

عملی سطح پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمی یعنی ریاست کے غیر مسلم شہری کے خون کو سخت تحفظ دیا۔ حدیث میں ہے کہ جس نے کسی معاہد کو ناحق قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو دور سے محسوس ہوتی ہے، یہ روایت بخاری میں ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ خبردار، جس نے کسی ذمی پر ظلم کیا، اس کا حق کم کیا، اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا یا اس کی رضا کے بغیر کوئی چیز لی تو قیامت کے دن میں اس کے مقابلے میں مدعی ہوں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ عمل تھا کہ ایک یہودی کے جنازے کے گزرنے پر آپ احتراماً کھڑے ہوئے اور صحابی کے تعجب پر فرمایا کہ کیا وہ انسان نہیں ہے۔ اسی طرح ایک یہودی نے آپ کی خدمت میں اپنے قرض کا تقاضا سختی سے کیا تو آپ نے صحابہ کے ردعمل کو روکا اور حق دار کا حق فوراً ادا کرنے کا حکم دیا۔ بازار میں غیر مسلم تاجروں کو مساوی تجارتی حقوق حاصل تھے اور جزیہ کے نظام میں بھی مالی بوجھ کو طاقت کے مطابق رکھا گیا، نیز بوڑھے، بچے، عورتیں اور عبادت میں مشغول لوگ لڑائی کے دائرے سے بھی مستثنیٰ رکھے گئے۔ ان مظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ اقلیت کا تحفظ صرف قانونی شق نہیں تھا بلکہ سربراہِ ریاست کے ذاتی رویے سے روزانہ ثابت ہوتا تھا۔

قتل، قصاص اور قانونی مساوات کے تناظر میں

عدلِ اجتماعی کا اصل امتحان فوجداری قانون میں ہوتا ہے کیونکہ یہیں اکثر طاقت ور کمزور پر امتیاز برتتا ہے۔ عہدِ نبوی میں اس تناظر میں کئی اصول اور مثالیں ملتی ہیں۔ پہلا اصول یہ تھا کہ غیر مسلم شہری کے قتل پر بھی قصاص و دیت کا قانون لاگو ہوتا ہے؛ فقہاء کی اکثریت کے نزدیک ذمی کے قتل میں قاتل سے قصاص لیا جائے گا یا دیت لازم آئے گی، اور اس مسئلے کی فقہی تفصیلات کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ قرآن نے بھی قتل کے قانون کو عمومی رکھا اور اہلِ کتاب کے مقتول کے ورثا کو دیت کی ادائیگی کا حکم سورۃ النساء آیت 92 میں اس صورت کے ساتھ بیان کیا جب مقتول اس قوم سے ہو جس سے معاہدہ ہو۔ دوسرا مظہر یہ تھا کہ عدالت میں غیر مسلم فریق کو مسلم فریق کے برابر سنا جاتا تھا؛ حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے دور کا مشہور واقعہ اگرچہ خلافت کا ہے، جس میں خلیفہ اپنی زرہ کے مقدمے میں یہودی شہری کے مقابل قاضی کے سامنے کھڑا ہوا اور ثبوت نہ ہونے پر مقدمہ ہار گیا، اسی نبوی نظام کی توسیع ہے۔ تیسرا مظہر سزا میں امتیاز کی ممانعت ہے؛ مشہور حدیث میں معزز خاندان کی چور عورت کے لیے سفارش رد کر کے فرمایا گیا کہ پچھلی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ کمزور پر حد جاری کرتے اور طاقت ور کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس اصول کا اطلاق مذہبی امتیاز پر بھی ہوتا ہے کہ معاہد شہری کے خلاف جرم میں مسلم مجرم کو کوئی رعایت نہیں ملتی۔ چوتھا مظہر یہ ہے کہ قصاص و سزا کا احیار عدالت کو تھا، کسی فرد یا قبیلے کو اپنے ہاتھ سے بدلہ لینے کی اجازت نہیں تھی، یہی اصول آج بھی برقرار ہے اور اس کا فیصلہ ہمیشہ مجاز عدالت کرتی ہے۔

جدول 2: اقلیتوں کے ساتھ عدل کے مظاہر اور ان کی بنیاد

مظہر	مثال / اسوہ	نتیجہ
تحریری معاہدہ	میثاقِ مدینہ؛ نجران کا معاہدہ	حقوق حکمران کی مہربانی نہیں، دستاویزی حق
جان کا تحفظ	معاہد کے قتل پر سخت وعید والی حدیث	غیر مسلم کی جان بھی محترم و محفوظ
مالی تحفظ	طاقت سے زیادہ بوجھ کی ممانعت؛ جزیے میں رعایت	معاشی استحصال سے تحفظ
عدالتی مساوات	سفارش کی ممانعت؛ قانون سب کے لیے برابر	فوجداری قانون میں مذہبی امتیاز نہیں
مذہبی آزادی	یہود و نصاریٰ کی عبادت و عبادت گاہوں کا تحفظ	عقیدے میں جبر کی نفی

اس نظام کی اہمیت اور آج کے لیے سبق

عہدِ نبوی کے اس عدل کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ ساتویں صدی میں دنیا میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا یہ معیار عام نہیں تھا؛ مذہبی اختلاف اکثر اجتماعی قتل و جلاوطنی کا سبب بنتا تھا۔ اسلام نے اس دور میں تحریری معاہدہ، مساوی فوجداری قانون اور سربراہ کا ذاتی نمونہ دے کر یہ ثابت کیا کہ عدل اکثریت و اقلیت نہیں دیکھتا۔ اس نظام کی ایک

خصوصیت یہ بھی ہے کہ حقوق کے ساتھ اقلیتوں پر بھی وہی معاشرتی ذمہ داریاں تھیں، یعنی معاہدے کی پاسداری اور ریاست سے وفاداری، اس طرح حقوق و فرائض کا توازن قائم رہا۔ آج کے طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ اپنے محلے، ادارے اور ملک میں کسی بھی اقلیتی شہری کی جان، مال، عزت اور عبادت کا احترام اسی نبوی اصول کی پیروی ہے، اور کسی کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر ناانصافی کرنا اس عدلِ اجتماعی کی خلاف ورزی ہے جس کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ یہ بھی واضح رہے کہ تاریخی واقعات کا علمی ذکر کسی معاصر تنازعے کا فیصلہ نہیں ہوتا؛ آج کے معاملات میں حکم و نفاذ کا اختیار عدالتوں اور اہلِ علم کا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ عدلِ اجتماعی میثاقِ مدینہ جیسے تحریری معاہدوں، جان و مال کی سخت حرمت، قتل و قصاص میں مساوی قانون اور عدالتی سفارش کی ممانعت کے ذریعے عملاً قائم ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو قیامت کے دن ذمی پر ظلم کرنے والے کے مقابل مدعی قرار دے کر اس عدل کو سب سے بلند اخلاقی و دینی ضمانت دی۔ یہ نظام انسانی حقوق کی تاریخ میں اقلیتی تحفظ کی اولین اور عملی مثال کے طور پر ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

سوال نمبر 3: معذور افراد کے حقوق (20 نمبر)

سوال نمبر 3: قرآن و حدیث کی روشنی میں معذور افراد کے حقوق بیان کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

معذور افراد سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیدائشی یا حادثاتی طور پر کسی جسمانی، ذہنی، بصری یا سماعتی کمی کا شکار ہوں اور اس وجہ سے روزمرہ زندگی کے بعض کاموں میں دوسروں کے تعاون کے محتاج ہوں۔ تاریخ میں بہت سے معاشروں نے معذوروں کو بوجھ سمجھا، انہیں شرمندگی کا سبب قرار دیا یا ان کی پیدائش کو بدشگونی سے جوڑا۔ اسلام کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہے: اسلام معذوری کو انسان کی قدر و قیمت میں کمی کا سبب نہیں مانتا، معذور کو مکمل عزت، مساوی حقوق اور خاص رعایتوں کا حق دار قرار دیتا ہے، اور اس کی دیکھ

بھال کو عبادت و ثواب کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس جواب میں قرآن مجید کی بنیادی آیات، خصوصاً سورۃ عبس کا واقعہ اور سورۃ النور و الفتح کی رخصتیں، پھر احادیث و سیرت کے مظاہر، پھر معذوروں کے حقوق کی منظم فہرست اور آخر میں معاشرے و ریاست کی ذمہ داریاں بیان کی جائیں گی۔

قرآنی بنیاد: سورۃ عبس اور مساواتِ قدر

معذوروں کے احترام کی سب سے مشہور قرآنی مثال سورۃ عبس کا آغاز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے سرداروں کو دعوت دینے میں مشغول تھے کہ نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ علم کی طلب میں حاضر ہوئے اور گفتگو میں مداخلت ہوئی، جس پر چہرے کے معمولی تاثر پر بھی اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتدائی آیات نازل فرما کر یہ اصول قائم کر دیا کہ علم و ہدایت کا طالب معذور شخص سرداروں کے اجتماع سے زیادہ توجہ کا حق دار ہے، کیونکہ اللہ کے نزدیک قدر دولت و قوت سے نہیں بلکہ تقویٰ و اخلاص سے ہے۔ ان آیات کی خاص بات یہ ہے کہ یہ تنبیہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے نازل ہوئیں، جس سے بعد کے تمام حکمرانوں اور معلمین کے لیے سبق بن گیا کہ کوئی معذور درخواست گزار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بعد میں مدینہ میں مؤذن مقرر کیا گیا اور کئی مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ کا نائب بھی بنایا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ معذوری منصب و ذمہ داری کی اہلیت میں رکاوٹ نہیں سمجھی گئی۔ قرآن نے اسی طرح نابینا، لنگڑے اور مریض پر جہاد جیسی سخت عبادت میں رخصت کا ذکر سورۃ النور آیت 61 اور سورۃ الفتح آیت 17 میں فرمایا کہ ان پر کوئی حرج نہیں، یعنی معذوری کو الزام نہیں بلکہ شرعی رعایت کی بنیاد قرار دیا گیا۔

احادیث و سیرت میں معذوروں کا مقام

احادیث میں معذوری کو آزمائش اور اجر کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ حدیث قدسی کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے مومن بندے کی دو محبوب چیزوں یعنی آنکھوں سے آزمائش کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے تو میں اس کے بدلے اسے جنت عطا کرتا ہوں، یہ روایت بخاری میں ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ مسلمان کو جو تھکاوٹ، بیماری، غم اور تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ اس کے بدلے اس کے گناہ مٹا دیتا ہے۔ ان احادیث نے معذور شخص کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا کہ وہ اپنے آپ کو

منحوس یا کمتر نہ سمجھے بلکہ صبر کو سعادت سمجھے۔ سیرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معذوروں کو معاشرے کے کنارے پر نہیں رکھا بلکہ مرکز میں شامل کیا: نابینا صحابی مؤذن و نائب ہوئے، جزام جیسے مرض کے مریضوں کے بارے میں بھی انسانی عزت کی تعلیم دی گئی اور کمزوروں کو تلاش کر کے ان کی مدد کو امت کی کامیابی سے جوڑا گیا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ تمہیں تمہارے کمزوروں کی وجہ سے رزق و مدد دی جاتی ہے۔ معذوروں کا مذاق اڑانے، انہیں برے لقب دینے اور ان کی طرف حقارت سے دیکھنے کو سورۃ الحجرات کی تمسخر و تنابز کی ممانعت کے تحت حرام قرار دیا گیا۔ صحابہ کے دور میں بیت المال سے معذوروں اور لاچاروں کے وظائف کی مثالیں بھی کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں، جو معذوروں کی کفالت کو ریاستی ذمہ داری بناتی ہیں۔

جدول 3: معذور افراد کے حقوق اور ان کا ماخذ

ماخذ / مثال	نوعیت	حق
الحجرات: 11 کا اصول	مذاق، لقب و حقارت کی ممانعت	عزت و عدمِ تمسخر
النور: 61؛ الفتح: 17	عبادات و جہاد میں معذوری پر رعایت	شرعی رخصت
ابنِ ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا مؤذن و نائب ہونا	حسبِ صلاحیت منصب و ذمہ داری	اہلیت و شرکت
مصارفِ زکوٰۃ کا عمومی اصول	بیت المال، زکوٰۃ و صدقے سے مدد	کفالت و مالی مدد
سورۃ عبس کا واقعہ	درخواست و علم میں ترجیحی توجہ	توجہ و تعلیم

معذور افراد کے حقوق کی منظم تفصیل

نصوص کو سامنے رکھ کر معذور افراد کے حقوق یوں بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اول حقِ عزت و تکریم: معذوری کی بنیاد پر کسی کی تذلیل، نقل اتارنا یا برا نام رکھنا گناہ ہے اور اس کا مکمل نام و احترام سے خطاب اس کا حق ہے۔ دوم حقِ رخصت و سہولت: نماز میں بیٹھ کر یا اشارے سے پڑھنے کی اجازت، روزے اور حج میں استطاعت کی شرط اور کاموں میں

طاقت کے مطابق ذمہ داری اسی حق کی صورتیں ہیں، حدیث میں ہے کہ مریض کا اجر اس عمل کے برابر لکھا جاتا ہے جو وہ صحت میں کرتا تھا۔ سوم حقِ تعلیم و روزگار: معذور کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم اور باعزت روزگار کا موقع ملنا چاہیے، اسے بھکاری بنانا اسلام کی تعلیم نہیں بلکہ اہل بنا کر خود دار بنانا مطلوب ہے۔ چہارم حقِ کفالت: جو معذور کمانے سے قاصر ہو اس کی کفالت پہلے اہلِ خانہ، پھر اقارب اور پھر ریاست و بیت المال کی ذمہ داری ہے اور وہ زکوٰۃ کے مصارف میں بطور فقیر و مسکین شامل ہو سکتا ہے۔ پنجم حقِ شرکت: مسجد، تعلیمی ادارے اور عوامی مقامات تک اس کی رسائی آسان بنانا، اس کی رائے سننا اور شادی و خاندانی زندگی کے حق کو تسلیم کرنا سماجی شرکت کے حقوق ہیں۔ ششم حقِ وراثت و ملکیت: معذوری کسی کے مالک ہونے، ورثہ پانے یا گواہی و معاہدے کی اہلیت کو ختم نہیں کرتی، الا یہ کہ شرعی طور پر عقل ہی متاثر ہو تو اس کے مال کی حفاظت کے لیے سرپرستی کا نظام فقہ میں بیان ہوا ہے، جس کا مقصد بھی اسی کے مال کا تحفظ ہے۔

معاشرے اور طالب علم کی ذمہ داری

معذوروں کے حقوق صرف قانون سے پورے نہیں ہوتے، ان کے لیے معاشرتی رویہ بدلنا ضروری ہے۔ راستے میں نابینا کی رہنمائی، بس و مسجد میں جگہ چھوڑنا، عمارتوں میں ڈھلوان راستے اور سہولتیں بنانا، اشاروں کی زبان سیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور معذور بچوں کو عام بچوں کے ساتھ تعلیم دلانا آج کے دور کے وہ کام ہیں جو اسی نبوی اصول کی عملی صورتیں ہیں کہ کمزور کی مدد اللہ کی مدد کا سبب ہے۔ والدین کے لیے ضروری ہے کہ معذور بچے کو چھپانے یا اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس کی صلاحیت تلاش کریں، کیونکہ تاریخ میں بہت سے نابینا و معذور علماء، محدثین اور حفاظ نے علم و فن میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ طالب علم کے لیے پیغام یہ ہے کہ وہ اپنے ادارے میں معذور ساتھی کو ترس کا نہیں بلکہ احترام و تعاون کا حق دار سمجھے، اس کے نوٹس، نقل و حرکت اور امتحانی سہولتوں میں مدد کرے اور یہ یاد رکھے کہ آج کی صحت و قوت بھی اللہ کی عطا ہے جو کسی وقت بھی آزمائش میں بدل سکتی ہے۔ ریاست کی سطح پر معذوروں کے لیے خصوصی تعلیم، وظائف، نوکریوں میں مناسب نمائندگی اور قابلِ رسائی عمارتوں کے قوانین اسی اسلامی اصول کی جدید ادارہ جاتی شکل ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث نے معذور افراد کو مکمل انسانی عزت، شرعی رخصت، تعلیم وروزگار کا موقع، کفالت، سماجی شرکت اور ملکیت وو راثت کے مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔ سورۃ عبس نے معذور کی توجہ کو سرداروں پر بھی مقدم کر کے اس نظام کی روح بیان کر دی، اور سیرت نے نابینا صحابی کو مؤذن و نائب بنا کر اس کا عملی ثبوت فراہم کیا۔ معذوری اسلام کی نظر میں کمی وعار نہیں بلکہ آزمائش واجر کا باب ہے، اور معذوروں کے حقوق کی ادائیگی پورے معاشرے کی انسانی و دینی پختگی کا پیمانہ ہے۔

سوال نمبر 4: دینِ فطرت اور باہمی حقوق کا احترام (20 نمبر)

سوال نمبر 4: اسلام کو دینِ فطرت قرار دیتے ہوئے یہ واضح کریں کہ باہمی حقوق کے احترام اور ان کی پامالی سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ (20 نمبر)

تعارف

اسلام کو دینِ فطرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسان کی اصل فطرت یعنی اس کی پیدا کردہ ساخت، ضمیر کی آواز اور عقلِ سلیم کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ جس طرح آنکھ روشنی کے لیے اور کان آواز کے لیے بنا ہے، اسی طرح انسان کا باطن سچائی، انصاف، رحم اور حقوق کے احترام کے لیے بنا ہے؛ جب انسان ان اصولوں پر چلتا ہے تو اسے سکون ملتا ہے اور جب ان سے ہٹتا ہے تو فرد بھی بے چین ہوتا ہے اور معاشرہ بھی۔ اس جواب میں پہلے دینِ فطرت کا قرآنی تصور واضح کیا جائے گا، پھر باہمی حقوق کے احترام کے مثبت اثرات اور آخر میں حقوق کی پامالی کے منفی اثرات کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسلامی نظامِ حقوق کوئی مصنوعی بوجھ نہیں بلکہ انسانی فطرت کی تکمیل ہے۔

دینِ فطرت کا قرآنی تصور

سورۃ الروم آیت 30 میں ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے رخ کو دین کی طرف یکسو ہو کر رکھو، یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ مفسرین نے اس فطرت سے مراد وہ اصل استعداد لی ہے جس کے ساتھ ہر بچہ پیدا ہوتا ہے، اور حدیث میں اس کی تائید ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں، یہ روایت بخاری و مسلم میں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر انسان پیدائشی طور پر شریعت کی تفصیلات جانتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ توحید، سچ، انصاف، رحم اور دوسروں کے حق کا احترام انسان کے اندر رکھا گیا ہے اور وحی اسی اندرونی آواز کو جگا کر اسے مکمل نظام کی شکل دیتی ہے۔ اسی لیے قرآن اپنے احکام کو بوجھ نہیں بلکہ یاد دہانی کہتا ہے اور رسول کو مذکر یعنی یاد دلانے والا قرار دیتا ہے۔ جب حقوق کا نظام فطرت کے مطابق ہو تو اس کی پابندی انسان کو مشین کی طرح نہیں بلکہ شکر گزار بندے کی طرح کرنی پڑتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حقوق العباد کی ادائیگی عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی پامالی کو صرف قانونی جرم نہیں بلکہ ضمیر و آخرت کا جرم بھی سمجھا جاتا ہے۔

باہمی حقوق کے احترام کے مثبت اثرات

جب معاشرے میں باہمی حقوق کا احترام عام ہو جائے تو اس کے اثرات کئی سطحوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا اثر اعتماد ہے؛ جب ہر شخص جانتا ہو کہ اس کی جان، مال، عزت اور وعدہ محفوظ ہے تو وہ دوسروں سے بے خوف معاملہ کرتا ہے، تجارت پھلتی ہے، قرض و امانت کا نظام چلتا ہے اور کاروباری لاگت کم ہو جاتی ہے کیونکہ ہر معاملے کے لیے عدالت و ضمانت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرا اثر امن و سکون ہے؛ حقوق کی ادائیگی تنازعات کی جڑ کاٹ دیتی ہے، گھریلو تشدد، محلے کے جھگڑے اور پیشہ ورانہ استحصال کم ہوتے ہیں اور پولیس و عدالتوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تیسرا اثر کمزور طبقات کا تحفظ ہے؛ یتیم، بیوہ، مزدور، معذور اور اقلیت کو جب حق مانگنا نہیں پڑتا بلکہ خود ملتا ہے تو ان کی خود داری محفوظ رہتی ہے اور وہ معاشرے کے کارآمد رکن بنتے ہیں۔ چوتھا اثر اخلاقی و روحانی ترقی ہے؛ حق ادا کرنے والا انسان تکبر سے بچتا ہے، اس میں شکر، رحم اور انصاف پیدا ہوتا ہے اور اس کی عبادت میں وزن آتا ہے کیونکہ حدیث کے مطابق بہترین مسلمان وہ ہے جس کی زبان و ہاتھ سے دوسرے محفوظ رہیں۔ پانچواں اثر خاندانی استحکام ہے؛ میاں

بیوی، والدین و اولاد اور بھائی بہن جب ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں تو گھر جنت کا نمونہ بنتا ہے اور طلاق، قطع رحمی اور وراثت کے جھگڑے کم ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام اثرات مل کر اس معاشرے کو بناتے ہیں جسے قرآن نے خیرِ امت اور متوازن امت کے اوصاف سے یاد کیا ہے۔

حقوق کی پامالی کے منفی اثرات

اس کے برعکس جب حقوق کی پامالی عام ہو جائے تو اس کے اثرات بھی سرایت کر پھیلتے ہیں۔ انفرادی سطح پر حق تلفی کا شکار شخص مایوسی، غصے اور احساسِ محرومی میں مبتلا ہوتا ہے، اس کا نظام و اداروں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور بعض اوقات وہ خود قانون ہاتھ میں لینے یا بدلہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ خاندانی سطح پر پامالی سے ناچاقی، طلاق، والدین کی نافرمانی اور وراثت کے مقدمے پیدا ہوتے ہیں جو نسلوں تک دشمنیاں چلاتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر جب مزدور کی اجرت روک لی جائے، تاجر ناپ تول میں کمی کرے، افسر رشوت لے اور طاقت ور کمزور کا حق مارے تو کرپشن، مہنگائی، جعل سازی اور عدم اعتماد کا چکر شروع ہو جاتا ہے جسے قرآن نے تطفیف، اکلِ مال بالباطل اور ظلم کی صورت میں مذمت کی ہے۔ ریاستی سطح پر ناانصافی بغاوت، احتجاجی انتشار اور اداروں کی کمزوری کو جنم دیتی ہے؛ تاریخ گواہ ہے کہ سلطنتوں کا زوال بیرونی حملے سے پہلے اندرونی ظلم سے شروع ہوتا ہے۔ دینی سطح پر حقوق کی پامالی عبادت کے اثر کو بھی ختم کر دیتی ہے، کیونکہ حدیث میں مفلس اسے قرار دیا گیا ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا مگر لوگوں کے حقوق مارنے کی وجہ سے اس کی نیکیاں حق داروں کو دے دی جائیں گی اور وہ خالی ہاتھ رہ جائے گا۔ یہ حدیث مسلم میں ہے اور اس سوال کا سب سے پر اثر نکتہ یہی ہے کہ حقوق کی پامالی دنیا میں معاشرہ اور آخرت میں فرد دونوں کو برباد کرتی ہے۔

جدول 4: حقوق کے احترام اور پامالی کے اثرات کا موازنہ

پہلو	احترام کے اثرات	پامالی کے اثرات
اعتماد	معاملات آسان، امانت و قرض کا نظام مضبوط	دھوکا، عدم اعتماد، ہر کام میں ضمانت کی لاگت
امن	تنازعات کم، اداروں پر بوجھ ہلکا	جھگڑے، مقدمے، قانون ہاتھ میں لینے کا رجحان

استحصال، بھیک و محرومی، احساسِ کمتری	عزت کے ساتھ حق ملنا، خود داری محفوظ	کمزور طبقات
ناچاقی، طلاق، وراثت کے تنازعات	محبت، استحکام، صلح رحمی	خاندان
مفلس والی حدیث کے مطابق نیکیوں کی منتقلی	نیکیوں میں اضافہ، نجات کی امید	آخرت

فطرت، ضمیر اور قانون کا باہمی تعلق

اس سوال کی گہرائی اس نکتے میں ہے کہ اسلام حقوق کے احترام کے لیے تین محرک بیک وقت استعمال کرتا ہے۔ پہلا محرک فطرت و ضمیر ہے، جو انسان کو اندر سے روکتا اور ترغیب دیتا ہے؛ دوسرا محرک معاشرتی اخلاق ہے، جس میں اچھی شہرت، خاندان کی تربیت اور علماء و اساتذہ کی رہنمائی شامل ہے؛ تیسرا محرک قانون و عدالت ہے، جو ضمیر کی نہ سننے والوں کو باز پرس کرتا ہے۔ مغربی نظام عموماً تیسرے محرک پر زیادہ انحصار کرتا ہے، اس لیے وہاں حقوق کی حفاظت ہمیشہ کمی سے اور نفاذ کے بعد بھی اکثر دیر سے ملتی ہے۔ اسلام فطری ضمیر کو جگا کر زیادہ تر حقوق گھر اور محلے کی سطح پر ادا کرا دیتا ہے اور قانون کو آخری درجے میں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس معاشرے میں دینی تربیت کمزور ہو جائے وہاں قوانین کی بھرمار کے باوجود حق تلفی بڑھ جاتی ہے۔ طالب علم کے لیے عملی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کو زندہ رکھے، چھوٹے سے چھوٹا حق بھی ادا کرے، کیونکہ فطرت کی آواز چھوٹے معاملات میں دبائی جائے تو بڑے معاملات میں بالکل خاموش ہو جاتی ہے، اور معاشرے بھر کا بگاڑ افراد کے انہی چھوٹے فیصلوں سے بنتا ہے۔

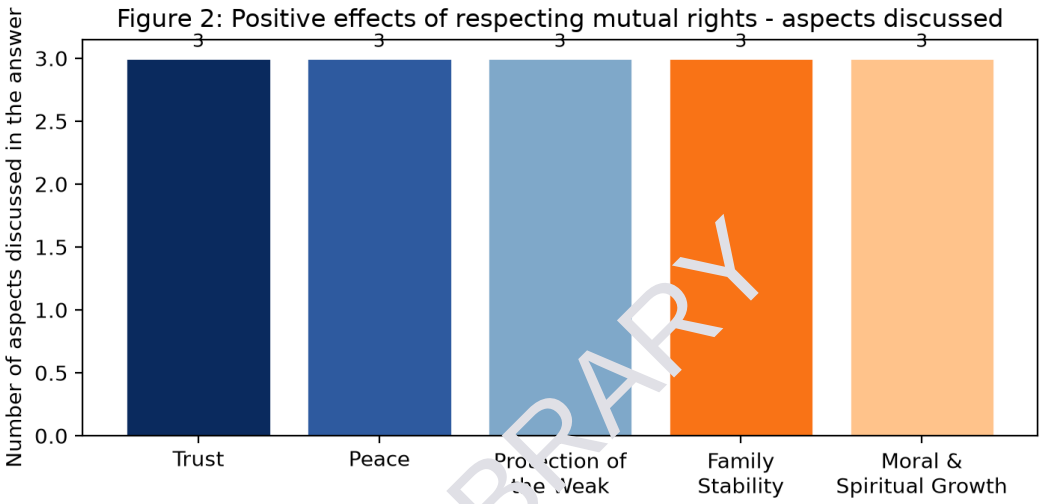

شکل2: باہمی حقوق کے احترام کے معاشرتی اثرات کا حالہ (تعلیمی خاکہ)

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اس لیے اس کا نظامِ حقوق انسان کے ضمیر اور عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے۔ باہمی حقوق کے احترام سے اعتماد، امن، کمزوروں کا تحفظ، خاندانی استحکام اور روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے، جبکہ ان کی پامالی سے بے اعتمادی، انتشار، استحصال، خاندانی بگاڑ، ریاستی کمزوری اور آخرت کا خسارہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے حقوق کا احترام محض قانونی تقاضا نہیں بلکہ فطرت کا تقاضا ہے، اور جو معاشرہ فطرت سے لڑتا ہے وہ خود اپنے سکون سے لڑتا ہے۔ یہی اس سوال کا مرکزی سبق اور پوری کتاب کے مطالعے کا حاصل ہے۔

سوال نمبر5: عورت کا حقِ کفالت اور شوہر کی ذمہ داریاں (20نمبر)

سوال نمبر5: اسلام میں عورت کے حقِ کفالت اور حسنِ سلوک کی بنیاد بیان کریں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں شوہر پر عائد معاشی واخلاقی ذمہ داریوں کی وضاحت کریں۔

(20نمبر)

تعارف

اسلام نے عورت کو وہ حقوق عطا کیے جن سے وہ اس دور میں عموماً محروم تھی، جن میں زندگی کا حق، تعلیم، ملکیت، وراثت، رائے اور باعزت کفالت سر فہرست ہیں۔ ان حقوق میں حقِ کفالت اس لیے بنیادی ہے کہ معاشی تحفظ کے بغیر عزت و سکون کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ بیوی کی حیثیت میں عورت کی کفالت کی ذمہ داری اسلام نے شوہر پر رکھی ہے اور اسے محض قانونی بوجھ نہیں بلکہ حسنِ سلوک، محبت اور رحمت کے ساتھ جوڑا ہے۔ اس جواب میں پہلے اس حق کی بنیاد یعنی نکاح کا قرآنی تصور اور قوامیت کا درست مفہوم بیان کیا جائے گا، پھر شوہر کی معاشی ذمہ داریاں یعنی مہر، نفقہ، رہائش اور اولاد کے اخراجات، پھر اخلاقی ذمہ داریاں یعنی حسنِ معاشرت، مشاورت، عزت و پردے کا تحفظ اور ظلم کی ممانعت واضح کی جائے گی، اور آخر میں توازن کے لیے بیوی کے متعلقہ فرائض کا مختصر ذکر بھی ہو گا تاکہ تصویر یک طرفہ نہ رہے۔ یہ بحث خالص تعلیمی ہے؛ کسی خاندانی تنازعے کا فیصلہ اہلِ علم، خاندانی مصالحت اور مجاز عدالت کا کام ہے۔

بنیاد: نکاح، مودت و رحمت اور قوامیت کا مفہوم

سورۃ الروم آیت 21 میں نکاح کو اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دے کر فرمایا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ اس آیت نے شادی کی بنیاد جبر و ملکیت نہیں بلکہ سکون، مودت اور رحمت بتائی ہے۔ سورۃ النساء آیت 34 میں مردوں کو عورتوں کا قوام یعنی نگران و کفیل قرار دیا گیا اور اس کی دو وجہیں بیان ہوئیں: اللہ کی عطا کردہ بعض خصوصیات اور یہ کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ علماء نے واضح کیا ہے کہ قوامیت حاکمیت یا برتریِ ذات کا نام نہیں بلکہ ذمہ داری کا منصب ہے، جیسے کسی ادارے کا نگران اپنے ماتحتوں کا مالک نہیں بلکہ ان کی خدمت و حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور کفالت کا خرچ اسی منصب کی عملی بنیاد ہے۔ یعنی مرد کو یہ درجہ اس لیے دیا گیا کہ وہ کمائے، خرچ کرے اور حفاظت کرے، نہ کہ اس لیے کہ وہ حکم چلائے اور عورت کی رائے و عزت کو بے وقعت سمجھے۔ سورۃ البقرہ آیت 228 میں فرمایا گیا کہ عورتوں کے لیے بھی اسی طرح حقوق ہیں جیسے ان پر ذمہ داریاں ہیں، دستور کے مطابق، جس سے باہمی حقوق کا توازن قائم ہوتا ہے۔ اس بنیاد سے واضح ہوا کہ کفالت احسان نہیں بلکہ حق ہے اور حسنِ سلوک اس حق کی روح ہے۔

شوہر کی معاشی ذمہ داریاں

معاشی ذمہ داریوں میں سب سے پہلے مہر آتا ہے۔ سورۃ النساء آیت 4 میں عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دینے کا حکم ہے اور آیت 20 تا 21 میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ طلاق کی صورت میں بھی دیا ہوا مہر واپس نہیں لیا جا سکتا چاہے وہ خزانہ ہی کیوں نہ ہو۔ مہر عورت کی ذاتی ملکیت ہے، اس میں شوہر یا خاندان کا کوئی حصہ نہیں۔ دوسری ذمہ داری نفقہ ہے، یعنی بیوی کی خوراک، لباس اور ضروریات اس کی اور شوہر کی حیثیت کے مطابق شوہر کے ذمے ہیں، خواہ بیوی خود مال دار ہی کیوں نہ ہو؛ اس کی ذاتی آمدن و جائیداد میں شوہر کو تصرف کا حق نہیں۔ سورۃ الطلاق آیت 7 میں اصول دیا گیا کہ کشادگی والا اپنی کشادگی کے مطابق خرچ کرے اور تنگ دست اپنی عطا کے مطابق، اللہ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔ تیسری ذمہ داری مناسب رہائش ہے، جس میں عورت کی عزت، پردہ اور سکون محفوظ ہو۔ چوتھی ذمہ داری اولاد کے اخراجات، تعلیم و علاج اور بیوی کی بیماری و زچگی کے اخراجات ہیں۔ پانچویں ذمہ داری یہ ہے کہ نفقے میں بخل اور فضول خرچی دونوں سے بچا جائے، اور حدیث کے مفہوم کے مطابق آدمی کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ اپنے زیرِ کفالت لوگوں کو ضائع کرے، یعنی ان کا حق نہ دے۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں بھی عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کے ساتھ ان کے کھانے اور لباس کی ذمہ داری دستور کے مطابق شوہر پر رکھی گئی۔

جدول 5: شوہر کی ذمہ داریاں — معاشی و اخلاقی

بنیاد	ذمہ داری	نوعیت
النساء: 4	مہر کی مکمل و خوش دلی سے ادائیگی	معاشی
الطلاق: 7	نفقہ: خوراک، لباس، ضروریات حسبِ حیثیت	معاشی
الطلاق: 6 کا مفہوم	مناسب و باعزت رہائش	معاشی
النساء: 19	حسنِ معاشرت اور معروف طریقے سے زندگی	اخلاقی

البقرہ: 231 تا 232 کا مفہوم	مشاورت، عزت کا تحفظ، ظلم و مار پیٹ کی ممانعت	اخلاقی

شوہر کی اخلاقی ذمہ داریاں

اخلاقی ذمہ داریوں کی جامع آیت سورۃ النساء آیت 19 ہے جس میں حکم ہے کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی کے طریقے سے زندگی بسر کرو، اور اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اس میں بہت بھلائی رکھ دی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل کے لیے بہترین ہو اور میں اپنے اہل کے لیے تم سب سے بہتر ہوں، یہ روایت ترمذی میں ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ مومنوں میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو اور جو اپنے اہل کے ساتھ سب سے زیادہ نرمی کرے۔ اخلاقی ذمہ داریوں میں بیوی کی رائے سننا اور خاندانی فیصلوں میں مشورہ کرنا شامل ہے؛ سیرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورے پر عمل کرنا مشہور مثال ہے۔ اسی طرح بیوی کے جذبات، پسند و ناپسند، اس کے والدین اور رشتہ داروں سے تعلق، اس کی تعلیم و صلاحیت کی حوصلہ افزائی اور اس کی غلطی پر درگزر و نرمی بھی اسی باب میں آتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں طلاق جیسے ناگزیر مرحلے پر بھی تنگی و ضرر پہنچانے کی ممانعت کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق ختم ہونے کی صورت میں بھی اخلاقی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ بیوی کی مار پیٹ، گالی، تذلیل، اس کا مال زبردستی لینا اور اسے میکے سے ملنے سے بلاوجہ روکنا ان تمام ذمہ داریوں کی خلاف ورزی اور ظلم ہے، جس کی بازپرس حدیث کے مطابق قیامت میں ہو گی۔

توازن: بیوی کے فرائض اور خاندانی نظام کا حاصل

اسلامی خاندانی نظام حقوق و فرائض کے توازن پر قائم ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ بیوی کے متعلقہ فرائض کا بھی ذکر ہو۔ بیوی پر گھر کی نگرانی و امانت، شوہر کے مال و عزت کی حفاظت، اولاد کی تربیت میں شرکت اور دستور کے مطابق شوہر کی جائز باتوں میں تعاون شامل ہے، اور حدیث میں عورت کو اپنے شوہر کے گھر کی نگران اور اس کے بارے میں جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔ اس توازن کی حکمت یہ ہے کہ کفالت کو خرید و فروخت نہ سمجھا جائے؛ شوہر خرچ کر کے احسان نہیں جتاتا کیونکہ یہ اس کا فرض ہے، اور بیوی گھر سنبھال کر مزدوری نہیں کرتی کیونکہ یہ اس کا وقار ہے، دونوں کے کام محبت و رحمت کے نظام میں عبادت بن جاتے ہیں۔ جدید دور میں جب بہت سی خواتین ملازمت

بھی کرتی ہیں تو فقہی اصول یہی رہتا ہے کہ اس کی آمدن اس کی ملکیت ہے، اگر وہ رضا سے گھر میں شریک ہو تو یہ اس کا احسان ہے، اس سے شوہر کی بنیادی کفالت کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی الا یہ کہ باہمی رضامندی سے کوئی اور ترتیب طے پائے۔ خاندانی تنازعات کی صورت میں قرآن نے حکم یعنی مصالحتی طریقہ بھی دیا ہے، تاکہ معاملات عدالت سے پہلے خاندان میں حل ہوں، اور آخری فیصلے کا اختیار بہرحال مجاز اداروں کا ہے۔ اس طرح اسلام کا یہ نظام عورت کو معاشی تحفظ، اخلاقی عزت اور خاندانی سکون ایک ساتھ فراہم کرتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے حقِ کفالت کی بنیاد نکاح کا مودت و رحمت والا قرآنی تصور اور قوامیت کی ذمہ داری پر مبنی مفہوم ہے۔ شوہر پر معاشی ذمہ داریوں میں مہر، نفقہ، رہائش اور اولاد کے اخراجات شامل ہیں اور اخلاقی ذمہ داریوں میں حسنِ معاشرت، مشاورت، عزت کا تحفظ، نرمی و درگزر اور ہر قسم کے ظلم سے اجتناب شامل ہے، جس کی بہترین مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ازدواجی زندگی ہے۔ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی سے گھر سکون و رحمت کا مرکز بنتا ہے اور ان کی پامالی پورے خاندانی نظام کو متزلزل کر دیتی ہے، یہی اس سوال کا مرکزی سبق ہے۔